مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب
اُستاذ عربی مدرسہ عالیہ رام پور (یوپی)

۲- دلائل کی تنقیح

(۴)

تیسری دلیل کی تنقیح | تملیک کے رُکن زکوٰۃ ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

"اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ" الآیہ نیز

"وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ"

اور لام براہ راست (جیسا کہ شوافع کا خیال ہے کہ یہ لام تملیک ہے) یا بالواسطہ (جیسا کہ مالکیہ کا خیال ہے کہ یہ لام جیرورۃ ہے یا احناف کا خیال ہے کہ یہ لام عاقبت ہے) تملیک کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ بدائع صنائع میں کاشانی نے لکھا ہے۔

"واما النص فقولہ تعالیٰ انما الصدقات للفقراء وقولہ عزوجل وفی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ والاضافۃ بحرف اللام تقتضی الاختصاص بجھۃ الملک اذا کان المضاف الیہ من اھل الملک"

لام کے افادۂ تملیک کے باب میں اصلاحی صاحب کو تین اعتراض ہیں۔ مگر ان اعتراضات کے نقل کرنے اور اُن کے جوابات کی تسوید سے پہلے میں اُن کا ایک کلیہ نقل کرتا ہوں (جسے پہلے بھی نقل کیا گیا ہے) اصلاحی صاحب کہتے ہیں۔

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شریعت میں کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کتاب وسنت کے اندر اس کی کوئی اصل ہو بغیر اس قسم کی کسی اصل کے کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دے دینا دین میں ایک اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے"

اب سوال یہ ہے کہ کیا تملیک کے حق میں اس قسم کی کوئی دلیل قرآن یا حدیث سے ملتی ہے"

(ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶ صفحہ ۴۲)

اس کلیہ کا جواب تو ہم پہلی قسط کے مقدمۂ ثانیہ میں دے چکے ہیں۔ حقائق دینیہ کا انھیں الفاظ کے ساتھ جن میں انھیں فقہاء و متکلمین نے مدون کیا ہے کتاب وسنت میں منصوص ہونا ضروری نہیں ہے ورنہ یہ قید تعطیل شرائع کے لئے اچھا خاصہ بہانہ بن جائے گی۔ مثال کے طور پر خود اصلاحی صاحب کے اسی کلیئے کو لیجئے۔ کوئی آیت یا حدیث نہ ملے گی جس کا یہ کلیہ اردو ترجمہ ہو۔ تو کیا صرف اتنی سی بات پر اس کلیے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ فقہائے امت اور علمائے کرام نے تعلیمات قرآنی کو وقت کی مروجہ زبان میں مدون کیا اگر کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جس کی اصل کتاب وسنت میں نہ ہو چنانچہ فقہائے احناف کا تو یہ غیر متبدل اصول رہا ہے۔ اُن کے نزدیک کسی حکم شرعی کا بغیر نص کے محض اپنی رائے سے طے کرنا امر مستبعد ہے۔ شمس الائمہ السرخسی رحمۃ اللہ المبسوط میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ففی المال الذی لا یمکن اعتبارهذہ النصب لو اوجبنا کان بالرأی لا بالنص"

امام سرخسی کا خط کشیدہ جملہ فقہائے احناف کی احتیاط کا مظہر ہے۔ ان فقہاء پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان تھا کہ اُس نے انھیں تفقہ فی الدین کا ملکہ عطا فرمایا

"وَمَنْ يُرِدِ اللهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ"

ورنہ یہ کڑی کمان ہر کس و ناکس کے زہ کرنے کی نہیں ہے ؎

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

لیکن اصلاحی صاحب نے جس طرح سخن پروری کی خاطر ان بزرگوں کے مساعی جمیلہ پر خاک

اڑانے کی سعی فرمائی ہے وہ ایک عالم کے شایانِ شان نہ تھی۔ بہرکیف لامؔ کے افادہ تملیک کے باب میں اصلاحی صاحب کو تین اعتراض ہیں۔

اولاً:۔ آیت کریمہ "اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ" تملیک فقراء کے لئے مسوق نہیں بلکہ اس کے سوق سے مقصود زکوٰۃ وخیرات کی رقموں کے اصلی حقدار اور مستحقین کا تعین ہے اس سلسلے میں وہ پہلے آیت کے سیاق وسباق کی وضاحت کے لئے اس کے پہلے کی دو آیتیں نقل فرماتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں

"غور کیجئے کہ اس سیاق میں بتلانے کی بات کیا ہوسکتی ہے۔ یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے یا یہ کہ زکوٰۃ وخیرات کی رقموں کے اصلی حقدار اور مستحق فلاں فلاں قسم کے لوگ ہیں! ظاہر ہے کہ اس سیاق میں بتلانے کی بات یہ دوسری ہی ہوسکتی ہے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶ صفحہ ۴۰)

اسی طرح پہلی دلیل کے سلسلے میں فرمایا ہے:۔

"قرآن میں جہاں کہیں بھی "وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" یا "تَصَدَّقُوْا" وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں وہاں متبادر مفہوم ان الفاظ کا صرف یہی ہے کہ زکوٰۃ دو اور صدقہ دو۔ سارا زور صدقہ اور زکوٰۃ ادا کرنے پر ہے اس سے بحث نہیں کہ یہ ادائیگی تملیک فقیر کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ یہ چیز "وَاٰتُوْا" اور "تصدقوا" کے الفاظ سے نہیں نکلتی۔" (ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶ صفحہ ۴۰)

اس اعتراض میں زورِ کلام پیدا کرنے کے لئے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا تھا:۔

"پہلی آیت (فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ) میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ان سے تعرض نہ کیا جائے یا یہ چاہتا ہے کہ جب تک یہ تملیک فقیر نہ کریں ان کا پیچھا نہ چھوڑا جائے"

ان اعتراضات کی توقع کم از کم اہلِ علم سے نہیں کی جاسکتی۔ عوام بیچارے تو اس قسم کے خطیبانہ استدلال سے دھوکا کھا سکتے ہیں مگر آیا خود معترض کا دل بھی اس قسم کے اعتراضات[1] سے مطمئن ہوسکتا ہے، مجھے اس باب میں شک ہے۔ بہرحال یہ اعتراضات علمی وقرآنی دونوں

[1] ترجمان القرآن ایضاً

حیثیتوں سے محلِ نظر ہیں۔

اوّل علمی حیثیت سے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے

آیاتِ قرآنی سے استدلال کی چند شکلیں ہیں۔ ان میں سے چار بہت زیادہ اہم ہیں بقیہ مختلف فیہا ہیں اور کم از کم احناف انھیں وجوہ فاسدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وجوہ اربعہ متفق علیہا یہ ہیں:- الاستدلال بعبارۃ النص، الاستدلال باشارۃ النص، الاستدلال بدلالۃ النص، اور الاستدلال باقتضاء النصّ، ان میں سے ما نحن فیہ کے لئے دو شرح وبسط کی مستحق ہیں

(i) الاستدلال بعبارۃ النصّ، اس ظاہر امر کے ساتھ عمل کرنے کو کہتے ہیں جس کے لئے کلام مسوق ہو، اور

(ii) الاستدلال باشارۃ النصّ، اُس چیز کے ساتھ عمل کرنا ہے جو نظم نص سے باعتبار لغت کے ثابت ہو مگر غیر مقصود ہو اور کلام کا اس کے لئے سیاق نہ ہوا ہو جیسے "وعلی المولود لہ رزقہنّ"

یہ آیت بچے کو دودھ پلانے والیوں کا نفقہ باپ پر واجب گردانتی ہے، اسی مقصد سے کلام کا سیاق ہوا ہے اور یہی متبادر مفہوم اس آیت کا ہے لہذا اس آیت سے مرضعات کا نان نفقہ بچے کے باپ پر واجب قرار دینا۔ الاستدلال بعبارۃ النص ہے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی نظم آیت سے باعتبار اُس کے لغوی معنی کے ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ بچہ کا نسب باپ ہی کی جانب منسوب کیا جائے گا۔ حالانکہ نہ اس بات کے ثابت کرنے کی غرض سے کلام کا سیاق ہوا ہے اور نہ یہ اس کا متبادر مفہوم ہے لہذا اس آیت سے یہ ثابت کرنا کہ بچے کا نسب باپ کی جانب منسوب ہوگا الاستدلال باشارۃ النص ہے۔

اب دونوں استدلالات کا حکم سنیئے:-

"وھما سواء فی ایجاب الحکم الا ان الاول احق عند التعارض"

یعنی استدلال بعبارۃ النص اور استدلال باشارۃ النص دونوں اپنی مراد پر قطعی الدلالت ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اگر ایک حکم ایک جگہ عبارۃ النص سے ثابت ہو اور اُس کا معارض حکم دوسری جگہ اشارۃ النص سے ثابت ہو تو تعارض کی حالت میں اول الذکر مرجح ہوگا۔

آیئے اب اصول فقہ کی تصریحات بالا کی روشنی میں آیت کریمہ "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ" کا مطالعہ کریں۔

اس میں تو شک نہیں کہ "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ" مستحقین زکوٰۃ کو اصناف ثمانیہ میں منحصر کرنے کے لئے مسوق ہے۔ لہٰذا مستحقین زکوٰۃ کو ان آٹھ صنفوں میں منحصر کر دینا اور اُن کے علاوہ کسی اور کو زکوٰۃ کا جائز حقدار قرار نہ دینا الاستدلال بعبارۃ النص ہے مگر نظم آیت سے لغتہً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ متصدقین کو مال زکوٰۃ کا براہ راست یا بتوسط امام و نائبین امام فقراء کو مالک بنا دینا بھی واجب ہے ہر چند کہ آیت اس کے وجوب کے لئے مسوق نہیں۔ لہٰذا دونوں حکم اپنی اپنی جگہ پر قطعی ہیں۔

بایں ہمہ اُس غلط فہمی کے ازالے کے لئے جو اصلاحی صاحب کے خطیبانہ استدلال سے شاید پیدا ہو گئی ہو دو باتیں خصوصیت سے سمجھ لینا ضروری ہیں۔

(۱) کسی آیت سے استدلال بعبارۃ النص کے ذریعے ایک حکم ثابت کرنا اس بات کے ہرگز منافی نہیں ہے کہ اُسی آیت سے استدلال باشارۃ النص کے ذریعے دوسری نوعیت کا دوسرا حکم ثابت کیا جائے۔

"لہٰذا یہ غلط ہے کہ اگر سیاق آیت کسی ایک امر کے اثبات کا للشان ہوا ہو تو پھر اور احکام کو اُس آیت سے ثابت ہی نہ کیا جائے یا اگر متبادر مفہوم کسی آیت سے ایک امر خاص کا ہوتا ہو تو دیگر مفاہیم سے صرف نظر کر لیا جائے"

"پس اگر آیت کریمہ "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ" کا سیاق یہ بتانے کے لئے ہوا ہو کہ زکوٰۃ و خیرات کی رقموں کے اصلی حق دار اور مستحق فلاں فلاں قسم کے لوگ ہیں تو اسی آیت

سے اس استدلال کا انکار غلط ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے فقراء کو یا اُن کے نائبین (امام و عاملین زکوٰۃ) کو مالک بنانا بھی ضروری اور واجب ہے۔"

"اسی طرح اگر "آتوا الزکوٰۃ" اور "تصدقوا" سے متبادر مفہوم یہ ہوتا ہو کہ زکوٰۃ دو، صدقہ دو، تو اس سے اس بات کا انکار کرنا غلط ہے کہ یہ ادائیگی تملیک فقیر (اصالتہً خود اُس فقیر کو یا نیابتہً اُس کے نائبین امام و عاملین زکوٰۃ) کی شکل میں ہونا چاہئے۔ اسی طرح اس متبادر مفہوم کے بعد یہ دعویٰ کرنا کہ یہ تملیک "آتوا" اور "تصدقوا" کے الفاظ سے نہیں نکلتی محض ادعائے باطل ہے۔

(ii) جو حکم کسی آیت سے استدلال باشارۃ النص کے ذریعے ثابت ہوتا ہے وہ بھی قطعی ہوتا ہے۔

"لہٰذا اس (ثابت باشارۃ النص) سے اعراض اور صرف نظر اعراض عن الشریعۃ کے مترادف ہوگا۔ والعیاذ باللہ۔

جب ایسا ہے تو آیت کریمہ "انما الصدقات للفقراء" سے مستحقین زکوٰۃ کا اصناف ثمانیہ میں منحصر ہونا اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ انما کا حصر اور لام اختصاص انتفاع سے یہ ثابت کیا جائے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے متصدقین علیہم کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے۔ بے شک سیاق میں بتانے کی بات پہلی ہی ہو سکتی ہے مگر سیاق ہی سب کچھ نہیں ہوتا وہ اس بات کا منافی نہیں ہے کہ زکوٰۃ بغیر تملیک متصدق علیہ کے ادا نہیں ہوتی۔

اسی طرح (توبہ ۵) میں ہر چند کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ان کو مسلموں سے تعرض نہ کیا جائے۔ لیکن یہ بتانا اس بتانے کے منافی نہیں ہے کہ انھیں اپنی زکوٰۃ متصدقین علیہم یا اُن کے نائبین کے قبضہ میں دینا ہے اور یہی تملیک ہے۔ اگر وہ زکوٰۃ امام المسلمین یا اُس کے نائبین کو دے دیں تو انھوں نے فقراء کو اُس کی تملیک کر دی (کیوں کہ امام کو اُن کی جانب سے ولایت عامہ حاصل ہے) لیکن اگر وہ فقراء کے نائبین (امام و عاملین زکوٰۃ) کو زکوٰۃ نہ دیں

تو بے شک اُن کا پیچھا نہ چھوڑا جائے گا - یہ ہمارا قول ہی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً یہ اُسی ہستی کا استدلال ہے جو غالباً سب سے زیادہ مزاج دان نبوت تھی یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، کا استدلال (جیسا کہ ہم پہلے اس کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔)

مسطورہ بالا توضیح کے بعد اصلاحی صاحب کو اصرار نہ ہونا چاہیئے کہ

"اس سے بحث نہیں کہ یہ ادائیگی تملیک فقیر کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں - یہ چیز "آتوا" اور "تصدقوا" کے الفاظ سے نہیں نکلتی۔"

یہ تھی ان اعتراضات کی اصولِ فقہ کے نقطۂ نظر سے تنقیح جو تفقہ فی الدین کے قواعد کلیہ کا نام ہے انصاف پسند طبائع کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان قواعدِ کلیہ کی ممارست اور مراعاۃ کے بغیر نصوص سے استنباطِ مسائل کا مدعا ع

ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

کا مصداق ہے - پھر بھی ممکن ہے کہ آزاد طبیعتیں اُن اصولوں کی مراعاۃ کو اپنے ذوقِ ہوا پرستی و شوقِ اجتہاد میں سدّ راہ سمجھ کر مکتبی ابحاث کا نام دیں تو ہم اس پر اصرار بھی نہیں کرنا چاہتے کیوں کہ ہم حنفی و غیر حنفی اصولیوں پر ایمان نہیں لائے ہم صرف کتاب اللہ اور سنت رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور اصولیوں کے قواعد کلیہ بھی اس لئے مانتے ہیں کہ وہ کتاب و سنت سے مستنبط ہیں۔ بہر کیف آزاد طبیعتوں کی تشفی کے لئے ہم اُن اعتراضات پر ذیل میں صرف قرآنی حیثیت سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

دوم قرآنی حیثیت سے :-

مسوق و غیر مسوق کی تدقیق تو اصولیوں نے سہولت تفقہ کی بنا پر کی ہے ورنہ اللہ کا کلام سب ایک ہی ہے اور واجب الاحترام اور واجب العمل ہونے کی حیثیت سے برابر ہے جو کچھ قرآن سے ثابت ہوتا ہے اور جس طرح ثابت ہوتا ہے ہمارے لئے واجب ہے اور اس میں انتخاب اختیار کی ہمارے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ"

اس کی تفصیل مقدمہ ثالثہ میں گذر چکی ہے۔ لہٰذا مقتضائے ایمان یہ ہے کہ نصوص قرآنی کے مفہوم کو بلا متبادر و غیر متبادر کی تفریق کے اپنا معمول بہ بنائیں یہ خوض و تعمق کہ اس سیاق میں بتانے کی بات یہ ہو سکتی ہے نہ کہ وہ اور اس لئے یہ واجب العمل ہے اور وہ واجب الترک

"اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ"

کا مصداق بنا دے گی۔ جو کچھ نصوص سے ثابت ہے ہمارا دین و ایمان ہے اور یہ متبادر و غیر متبادر یا مسوق و غیر مسوق کی تفریق و تدقیق محض اتباع وحی سے تتبع اہوا کی جانب فرار کا بہانہ ہے اور بس یہ پہلے اعتراض کی تنقیح ہے دوسرا اعتراض سنیئے:۔

ثانیاً:۔ آیت "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ" کی اندرونی تالیف لام کے افادہ تملیک کے لئے مساعدت نہیں کرتی کیوں کہ مصارف ثمانیہ میں سے پہلے چار لام کے تحت میں ہیں اور آخری چار فی کے تحت میں۔ کہتے ہیں:۔

"ظاہر ہے کہ کلام میں یہاں کوئی ایسی ہی تقدیر ماننا مناسب ہوگا جو لام کے ساتھ بھی مربوط ہو سکے اور فی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکے اگر لام کو تملیک کے معنی میں لیجئے تو آیت کا ابتدائی حصہ اس آخری حصے سے بالکل ہی بے ربط ہو کے رہ جائے گا کیوں کہ فی میں بہر حال تملیکیت کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا...... اگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ لام میں تملیک کا مفہوم لیا گیا تو آخری چار اصناف کے ساتھ تملیکیت کا مفہوم جوڑنے کے لئے کلام کی وسعت اور بلاغت کو بالکل ہی ذبح کر دینا پڑے گا جیسا کہ فی الواقع کیا بھی گیا ہے" (ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶ صہ)

لیکن اس اعتراض میں بھی خلط مبحث ہے یہ صحیح ہے کہ فی کے مفہوم میں تملیک کا قول کہیں دیکھنے میں نہیں آیا مگر ائمہ نحو میں سے کسی سے بھی لام میں وہ مفاہیم مروی نہیں جو فی میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا قدر مشترک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لام کے لئے نہ خدمت و مصلحت کا

مفہوم لیا جا سکتا ہے (جو اصلاحی صاحب " وفی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِیْنَ ...." کی فی کے واسطے تجویز کرتے ہیں) اور نہ فی کے واسطے استحقاق و انتفاع کا (جو وہ لام للفقراء کے واسطے تجویز کرتے ہیں) اس قسم کی تجویز لغت میں تصرف بے جا کے مترادف ہوگی جو ادعائے باطل کے سوا نہیں ہے اور اس کے بعد یقیناً نظم کلام خداوندی کی بلاغت موتھری چھری سے ذبح ہو جا گی

بہر کیف زیادہ سے زیادہ جو امر اس اعتراض سے ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلی چار اصناف کو صدقات کے ساتھ جو علاقہ ہے وہ اس علاقے سے مختلف ہے جو آخری چار اصناف کو ہے اور مفسرین کو اس کا احساس رہا ہے چنانچہ مدارک التنزیل میں ہے

" وعدل عن اللام الی فی فی الاربعۃ الآخیرۃ للایذان بانھم ارسخ فی التصدق علیھم ممن سبق ذکرہ لان فی للوعاء فنبہ علی انھم احقاء بان توضع فیھم الصدقات ویجعلوا مظنۃ لھا۔ وتکریر فی فی قولہ فی سبیل اللہ وابن السبیل فیہ فضل وترجیح لھٰذین علی الرقاب والغارمین "

اسی طرح تفسیر بیضاوی میں ہے۔

" والعدول عن اللام الی فی للدلالۃ علی ان الاستحقاق للجھۃ لا للرقاب وقیل للایذان بانھم احق بھا "

لہذا ایمان باللہ در اتباع قرآن کا تقاضہ ہے کہ بجائے اس کے کہ بتکلف دو مفہوموں کا قدر مشترک نکال کر دو حکموں کی نوعیت کو منشائے خداوندی کے خلاف تکلفاً اپنی خواہشات واہوار کے مطابق ایک بنا کر خود کو

" ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون "

کا مصداق بنائیں یہی بہتر ہے کہ نصوص قطعیہ کو اُن کے ظواہر معانی سے معدول کرنے کی کوشش نہ فرمائیں کم از کم اہل سنت والجماعت کا مسلک تو یہی ہے عقائد نسفی میں ہے۔

" والنصوص تحمل علی ظواھرھا والعدول عنھا الی معان یدعیھا اھل الباطن الحاد "

پس محض اس بنا پر کہ جو تملیک کا مفہوم لام میں پایا جاتا ہے فی کے اندر سرے سے مفقود ہے ہمیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ سرے سے "تملیک فی الزکوٰۃ" ہی کے منکر ہو جائیں۔ ہاں اگر ایجابی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ لام میں تملیک کا مفہوم نہیں پایا جاتا یا کم از کم "انما الصدقات للفقراء" میں لام تملیک کے واسطے نہیں ہے تو مسئلہ اصلاحی صاحب کے حسبِ منشا ثابت ہو جائے گا اور اس بات کی حاجت نہ ہوگی کہ وہ مفہوم فی کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں اور نہ کوئی ایسی تقدیر ڈھونڈھنے کا تکلف کرنا پڑے گا جو لام کے ساتھ بھی مربوط ہو سکے اور فی کے ساتھ بھی۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ اس باب میں کوئی ایجابی ثبوت نہیں دیا گیا۔ اعتراضات سلبی و استدلالی ہیں۔

ثالثاً:۔ تملیک کے نظریے کی عمارت لام للفقراء پر نہیں کھڑی کی جا سکتی کیوں کہ اس کا مفہوم مختلف فیہ ہے۔ کہتے ہیں

"بہر حال تملیک کے نظریے کی عمارت اگر للفقراء کے لام ہی پر کھڑی ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ بنیاد نہایت کمزور ہے اولاً تو اس کے مفہوم ہی کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں احناف اس کو لام عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں ....." (ترجمان القرآن ایضاً صفحہ ۴۰)

لیکن لام کے مفہوم کا مختلف فیہ ہونا بھی تملیک فی الزکوٰۃ کے وجوب میں قادح نہیں ہے اس کی تفصیل پانچویں دلیل کی وضاحت کے سلسلے میں آئے گی انشاء اللہ العزیز۔

چوتھی دلیل | تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی چوتھی دلیل جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زکوٰۃ کے متعلق ارشاد گرامی ہے کہ

"تؤخذ من أغنیاءھم وترد علی فقرائھم"

لیکن اصلاحی صاحب نے اسے کمال بے اعتنائی کے ساتھ نظر انداز کیا ہے۔ ترجمان القرآن کی دو قسطوں کے اندر "وجوبِ تملیک فی الزکوٰۃ" کے رد میں کم و بیش چھیالیس صفحہ کا ایک مبسوط مضمون لکھا ہے مگر اس حدیث کے ساتھ استدلال کو کہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا حالانکہ اپنی شہرت

واستفاضہ کی بنا پر یہ فرمان نبوی دین قدیم کی بنیادی تعلیمات میں ایک اہم مقام رکھتا ہے چنانچہ اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب الزکوٰۃ کے متعدد ابواب میں بیان کیا ہے مثلاً باب وجوب الزکوٰۃ، باب لا توخذ کرائم اموال الناس، باب اخذ الصدقۃ من الاغنیاء وترد فی الفقراء حیث کانوا وغیرہ میں۔ اسی طرح امام مسلم نے اپنی صحیح کے باب الدعاء الی الشہادتین وشرائع الاسلام اور امام ترمذی نے اپنی سنن کے باب ماجاء فی کراھیۃ اخذ خیار المال فی الصدقۃ میں اور دیگر محدثین نے اپنی اپنی کتب احادیث کے مختلف ابواب میں روایت کیا ہے[1]۔ محدثین کے علاوہ دیگر علماء نے بھی اسے کثیر طرق کے ساتھ بیان کیا ہے[2] مثلاً امام ابوبکر جصاص الرازی نے احکام القرآن میں "انما الصدقات للفقراء" کی تفسیر کرتے ہوئے متعدد جگہ روایت کیا ہے۔ ان تمام روایات میں ایک امر لفظاً ومعناً متفق علیہ ہے۔

"توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم"

اور اس کی نظیر وہ ارشاد نبوی ہے جسے امام جصاص الرازی نے بار بار احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ

"امرت ان آخذ الصدقۃ من اغنیاءکم واردھا فی فقراءکم"

بہرکیف حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا یہ حصہ کہ

"توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم"

دین مبین کا اہم اصول ہے اور کسی طرح اس بے اعتنائی و بے التفاتی کا مستحق نہیں، تھا جو اصلاحی صاحب نے اس کے سلسلے میں روا رکھی۔ اس حدیث سے عموماً اموال زکوٰۃ کو ایک

---

[1] چنانچہ ابن الہمام نے فتح القدیر میں اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے:۔ "رواہ اصحاب الکتب الستۃ فی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما" (فتح القدیر کشوری جلد اول ص ۳۵۵)

[2] اس کثرت طرق کی بنا پر حدیث معاذؓ شہرت کے اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اس سے زیادۃ علی الکتاب بھی ہو سکتی ہے ابن الہمام کہتے ہیں "لکن حدیث معاذ مشہور فجازت الزیادۃ بہ علی اطلاق الکتاب" (ایضاً)

جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کرنے" کے سلسلے میں استدلال کیا جاتا ہے لیکن تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی بھی یہی دلیل ہے اس کی تفصیل یہ ہے:-

ارشاد نبوی "توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم" کے بیان کردہ "اخذ" و "رد" میں مقابلہ ہے لہٰذا جو نوعیت "اخذ" کی ہوگی وہی نوعیت بعینہا "رد" کی ہونا چاہیئے کیوں کہ "توخذ" اور "تُرَدُّ" میں جو ضمائر مستتر ہیں اُن کا مرجع واحد ہے۔ اب دو صورتیں ہیں

(ا) یا تو بغیر قانونی موشگافی کو کام میں لائے ہوئے ایک عامی کے نقطۂ نظر سے اس سیدھی سادی بات کا مفہوم متعین کیا جائے تو عقلِ سلیم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "صدقات" تونگروں سے لئے جائیں اور فقراء میں بانٹ دئے جائیں" اور اس "لینے" اور "بانٹ دینے" کی حقیقت ہر عامی و عالم کے نزدیک یہی ہے کہ صاحبِ مال سے مالِ زکوٰۃ کی ملکیت کو منقطع کرلیا جائے اور اسی ملکیت کو متصدقین علیہم کی جانب منتقل کردیا جائے۔ یہی انتقالِ ملکیت "تملیک المال من الفقیر" ہے

(ب) لیکن اگر متفننانہ دِقتِ نظری کے ساتھ ہی اس مسئلے پر غور کرنے کا اصرار کیا جائے اور تملیک شخصی و تملیک اجتماعی یا تملیک انتفاع و تملیک بالقبض کی تدقیقات پیدا کی جائیں) تو اس کے نتیجہ میں بھی رد علی الفقراء کا مفہوم تملیک فقیر ہی قرار پائے گا اس لئے کہ مِلک نام ہے "حق تمتع و انتقال کا"، یہ نہ صرف قانونِ رائج الوقت ہی کا موقف ہے بلکہ اسلام کا بھی اصل الاصول ہے۔ ملکیت کے باب میں اسلام کے اس اصل الاصول کی توضیح تو پانچویں دلیل کے ضمن میں بیان ہوگی البتہ قانونِ رائج الوقت کا موقف مشہور ماہر قانون پالک (Pollak) کی اصولِ قانون Guris Prudence سے واضح ہوگا۔ اس ماہر قانون نے اس کتاب کے صفحہ ۱۷۵ پر ملکیت کی تعریف بدیں طور کی ہے کہ وہ (ملکیت)

"ان تمام اختیارات تمتع و انتقال کے مجموعے کا نام ہے جو از روئے قانون کسی شخص کو حاصل ہوسکتے ہیں"

(اصول قانون مصنفہ سامنڈ جلد دوم صـ حاشیہ)

پھر کوئی صاحب مال (owner of Property) مال یعنی شیئ مادّی کا مالک نہیں ہوا کرتا بلکہ اُن اختیارات تمتع و انتقال کا مالک ہوتا ہے جو از روئے قانون اس مال سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بظاہر یہ تدقیق مستبعد (Paradoxical) معلوم ہوتی ہے اور اس استبعاد کی وجہ بقول سامنڈ کے یہ ہے کہ

"لوگ ملک سے مراد شے مادّی لینے کے عادی ہو گئے ہیں اور ملک کے لئے شی کا مادّی ہونا ضروری خیال کرتے ہیں حالانکہ اس طرح کا طرزِ کلام صنائع و بدائع زبان میں داخل ہے۔ ملک کا اطلاق جو شی مادّی پر کیا جاتا ہے اس کو ایک قسم کا استعارہ یا مجاز سمجھنا چاہیئے۔ اور کثرتِ استعمال سے بظاہر اس کی شانِ مجازی باقی نہیں رہتی ہے۔" (اصول قانون سامنڈ جلد دوم صـ)

قانون رائج الوقت تو "شیئ مادی کی ملکیت" کو محض استعارہ و مجاز کہہ کر ہی بات ختم کر دیتا ہے مگر اسلامی آئیڈیالوجی کی رو سے کسی انسان کے لئے کسی شیئ مادی کے حقیقتاً مالک ہونے کا دعویٰ شرک و الحاد کا مقتضی ہے اس لئے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے مالک الملک تو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ قرآن کہتا ہے

"لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (مائدہ ۱۲۰)

"وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ" (بنی اسرائیل ۱۱۱)

اب چند شکلیں ہیں یا تو

(۱) ایک ہی شیئ مادی کے دو مالک حقیقی ہوں ایک خدائے تعالیٰ اور دوسرا انسان مگر یہ (بنی اسرائیل ۱۱۱) کا انکار ہے۔

(۲) یا صرف انسان مالک حقیقی ہو نہ کہ خدائے تعالےٰ یہ (مائدہ ۱۲۰) کا انکار ہے

(۳) یا صرف خدائے تعالیٰ مالک حقیقی ہو اس کی بھی دو شکلیں ہیں۔

۱۔ صرف خدائے تعالےٰ مالک حقیقی ہو اور انسان کا کائنات سے کسی قسم کا کوئی تعلق

نہ ہو مگر یہ شکل بھی۔

"هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" (بقرہ ۲۹)

کا انکار ہے کیوں کہ (بقرہ ۲۹) کا کہنا ہے کہ انسان کو اشیائے کائنات کا حق انتفاع دیا گیا ہے

(۲) یا خدائے تعالیٰ مالک حقیقی ہو اور انسان مالک مجازی بایں معنی کہ وہ اس کے حق تمتع کے مالک ہونے کا اہل ہے اور یہی اسلام کا موقف ہے پس اسلامی آئیڈیالوجی کی رو سے کوئی انسان کسی مادی شئی (concrete things.) کا مالک حقیقی نہیں ہو سکتا۔ صرف مجازی معنوں میں اسے مالک کہا جا سکتا ہے اور اس کی مجازی ملکیت کی حقیقت شاہ ولی اللہ صاحب رح کے لفظوں میں محض اتنی ہے کہ

"ومعنى الملك في حق الآدمي كونه احق بالانتفاع من غيره"

اس کی مزید تفصیل پانچویں دلیل کے ضمن میں آئے گی۔ غرض اسلامی آئیڈیالوجی ہو یا قانون رائج الوقت دونوں سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ

"سوائے حق کے کوئی دوسری شئی ملک نہیں ہو سکتی"

(اصول قانون سامنڈ جلد دوم ص۲)

اس قانونی توجیہ کی روشنی میں حدیث نبوی "توخذ من اغنیاءهم وترد علی فقرائهم" پر غور کیجئے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہاں اخذ و رد میں مقابلہ ہے لہذا جو نوعیت اخذ کی ہو گی وہی نوعیت بعینہ رد کی ہونا چاہیے کیوں کہ توخذ اور ترد میں جو ضمیریں مستتر ہیں ان کا مرجع واحد ہے اور وہ ہے "مال صدقہ کا حق تمتع و انتقال" کہ "توخذ" کے ذریعے صاحب مال سے، مال زکوٰۃ کے حق تمتع و انتقال کو منقطع کر کے مصدق اپنی تحویل میں لے لیتا ہے اور "ترد" کے ذریعہ مال زکوٰۃ کے حق تمتع و انتقال کو متصدقین علیہم کی جانب منتقل کر دیتا ہے اور بتوضیح بالا یہی "حق تمتع و انتقال" انسانی ملکیت کی حقیقت ہے۔ یعنی مصدق "توخذ" کے ذریعے مال زکوٰۃ کی ملکیت اصحاب اموال سے اپنی تحویل میں لے لیتا ہے اور "ترد" کے عمل کے ذریعہ وہی ملکیت فقراء و متصدقین علیہم کی جانب منتقل کر دیتا ہے۔ یہی انتقال ملکیت "تملیک المال من الفقیر" ہے

اور چوں کہ مال زکوٰۃ کا حق تمتع و انتقال "متصدقین و عاملین" کو نہیں ہوتا بلکہ اس

کے حقیقی حق دار صرف فقراء و متصدقین علیہم ہیں لہذا صدقات زکوٰۃ کے اصطلاحی مالک بھی فقراء و متصدقین علیہم ہیں۔ رہا امام تو گو اسے یک گونہ اختیارِ تصرف حاصل ہے کہ وہ اپنی صوابدید سے اصنافِ ثمانیہ میں مالِ زکوٰۃ کو تقسیم کر سکتا ہے مگر اُسے حقِ تمتع حاصل نہیں ہے لہذا قانونِ رائج الوقت کی رو سے بھی امام کا یہ وقتی اختیارِ تصرفِ فقراء و دیگر مستحقینِ زکوٰۃ کی ملکیتِ مالِ زکوٰۃ میں قادح نہیں ہو سکتا جیسا کہ پالک نے اپنے اصولِ قانون میں لکھا ہے

"ملک یا جائیداد پر چاہے کسی غیر کا بالراست اختیار کیوں نہ ہو لیکن مالک وہی شخص سمجھا جائے گا جس کو تمتع اور انتقال کا باقی حق ملا ہو۔"

(اصول قانون سامنڈ جلد دوم صفحہ حاشیہ)

لیکن جو لوگ زکوٰۃ میں تملیکِ شخصی کے منکر ہیں یا اُس کو ضروری نہیں سمجھتے اور اُن کے نزدیک "ترد علی فقرائھم" کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ دہندہ یا مصدق، متصدقین علیہم کی جانب صدقہ زکوٰۃ کا حقِ انتفاع منتقل کر دے نہ کہ ملکیتِ مصطلحہ تو اس بنا پر کہ "اخذ" و "رد" میں مقابلہ ہے اور دونوں کی نوعیت ایک ہی ہونا چاہیئے) لازم ہے کہ "توخذ من اغنیاءھم" کا بھی یہ مطلب ہو کہ اصحابِ اموال صدقہ زکوٰۃ کا حق انتفاع تو مصدق کی جانب منتقل کر دیں مگر صدقہ کی ملکیت مصطلحہ کو اپنے ہی پاس رہنے دیں[2] کیوں کہ "توخذ" اور "ترد" کے ضمائرِ مستتر

---

[1] مثلاً زکوٰۃ کی رقم سے غربا کی اجتماعی خدمت و بہبود کا کوئی چھوٹا بڑا کام کر دے مثلاً غریبوں کے محلے میں کوئی مسجد بنوا دے، اُن کی تعلیم دین کا کوئی ادارہ کھول دے، اُن کی ذہنی اور فکری تربیت کے لئے کوئی اسلامی لائبریری قایم کر دے، اُن کے مریضوں کے مفت علاج کے لئے کوئی شفاخانہ بنا دے، غریبوں کے کسی محلے میں اگر کنواں نہیں ہے تو اُن کے پانی پینے کے لئے کنواں بنوا دے۔ مسافروں کے لئے کوئی سرائے یا تالاب بنوا دے۔" (ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶ صفحہ ۲۹۸ بتفسیر قلیل)

[2] یا سامنڈ کی اصطلاح میں صدقہ زکوٰۃ کی ملکیت امانتی اپنے پاس رہنے دیں اور ملک انتفاعی مصدق کی جانب منتقل کر دیں لیکن اولاً تو مصدق انتفاع کلی کا اہل نہیں ہے اور ثانیاً ملک امانتی تو بڑی چیز ہے خلیفہ اول تو مرتدین کے پاس اتنا حق تصرف تک چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے کہ وہ صدقات زکوٰۃ کو اپنی صوابدید کے مطابق صرف کر سکیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے دوسری دلیل کی توضیح میں آیہ کریمہ "فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم" کی توضیح۔

کا مرجع ایک ہی ہے[1] لیکن یہ ایسی تجویز ہے کہ نہ کوئی اس کا قائل ہے نہ قائل ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہ امر قابلِ عمل ہے اور نہ متصور ہو سکتا ہے۔

پس اگر "اخذ" کی یہ نوعیت نہیں ہو سکتی تو "رد" کی بھی وہ نوعیت نہیں ہو سکتی جس کے اصلاحی صاحب مدعی یا خواہشمند ہیں کہ تملیک انتفاعی یا تملیک اجتماعی کے فخیم و مدہش نام دے کر صدقۂ زکوٰۃ کو رفاہِ عامہ کے کاموں کی تعمیر یا عوامی فلاح و بہبود کی اسکیموں میں لگایا جا سکے۔

غرض ایک عامی کے نقطۂ نظر سے دیکھئے یا ایک مقنن کی دقتِ نظری سے، حدیثِ مشہور "توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم" سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ صدقۂ زکوٰۃ کی ملکیت اغنیاء سے لے کر فقراء کی جانب منتقل کر دی جائے اور یہی "تملیک المال من الفقیر" ہے پھر یہ استدلال محض ایک استنباط کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ خود عہدِ نبوی کا معمول بہ ہے چنانچہ سنن ترمذی میں ہے۔

"حدثنا علی بن سعید الکندی حدثنا حفص بن غیاث عن اشعث عن عون بن ابی جحیفۃ عن ابیہ قال:۔ قدم علینا مصدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخذ الصدقۃ من اغنیاءنا فجعلھا فی فقراءنا۔ وکنت غلاما یتیما فاعطانی منھا قلوصا"

(ترمذی کتاب ابواب الزکوٰۃ باب ما جاء ان الصدقۃ توخذ من الاغنیا فترد علی الفقراء)

اس حدیث کے ہوتے ہوئے اصلاحی صاحب کے یہ فرمودات کہ

"جس کھیت یا کھلیان یا چراگاہ سے زکوٰۃ وصول ہوئی وہیں غربا و فقراء جمع ہو گئے اور تحصیلداروں نے اُن کے اندر زکوٰۃ کے مال کو تقسیم کر دیا اور دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے"[2]

"زکوٰۃ اسلامی معاشرے کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کوئی اجتماعی نوعیت کا کام نہیں ہو سکتا بلکہ ختم کی دیگ کی طرح اُس کا وہیں تقسیم کر دیا جانا لازمی ہے جہاں یہ پکائی گئی ہے تو اس کی افادیت کم از کم موجودہ زمانے کے اقتصادی ماحول میں تو بمنزلہ صفر ہو کے رہ جاتی ہے"[3]

کیا معنی رکھتے ہیں، اس کا فیصلہ صرف قارئین کرام ہی کر سکتے ہیں۔

---

[1] پس یہ معنی ہوں گے کہ اغنیاء سے صدقۂ زکوٰۃ کی ملکیت انتفاعی لے لی جائے اور اس ملکیت انتفاعی کو فقراء کی جانب منتقل کر دیا جائے۔ رہی ملکِ بالقبض سو اصحابِ اموال کے پاس رہے نہ مصدق اغنیاء سے اس ملک بالقبض کو اخذ کرے اور نہ فقراء کی جانب رد کرے۔ [2] ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶ ص ۳۹۶ [3] ایضاً ص ۳۹۹